گریہ و تبسم
صفیہ تبسم
JALALI BOOKS

صفیہ شمیم ملیح آبادی

۲ جولائی ۱۹۵۲ء

اشاعتِ اوّل

تعداد ایک ہزار

جنوری ۱۹۵۳ء

قیمت:

"بنامِ جلوۂ صبحِ بہاراں"

پیش لفظ

صفیہ شمیم ملیح آبادی میری حقیقی بھانجی ہے جس کی ماں انیس جہاں بیگم بھی شعر کا بہت اچھا ذوق رکھتی ہے اور اچھے شعر سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ کبھی تو سر دُھننے اور کبھی رونے لگتی ہے۔ اسی طرح میری مرحومہ بڑی بہن افسر جہاں بیگم بھی ادب و شعر کی بیحد قدرداں اور گرویدہ تھیں جس کا اندازہ اس چھوٹے سے واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز وہ انگنائی میں بیٹھی شعر و سخن کی باتیں کر رہی تھیں کہ میرے بڑے بہنوئی یعنی مرحومہ کے شوہر نے بڑی تعریف کے ساتھ کسی کا شعر انہیں سنایا۔ شعر سنتے ہی غصے سے اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور شوہر سے کہنے لگیں کہ اول تو گھٹیا شعر سناتے ہو اور پھر اضافت بھی کھا جاتے ہو۔
اسی طرح گھر کی تمام بڑی بوڑھیوں کو بھی ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ بات بات پر کہاوتیں کہی جاتیں اور شعر پڑھے جاتے تھے۔ اور میر انیس کا کلام تو گویا سب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔
یہ تو صفیہ کے گھر کی اندرونی ادبی فضا تھی اور اس پر طرّہ یہ تھا کہ بیرونِ خانہ سے بھی ادب کے جھونکے برابر آتے رہتے تھے۔ والد[۱] مغفور کی صحبت میں ہر روز شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ ہر مہینے مشاعرے

---

۱ جناب نواب بشیر احمد خاں صاحب بشیر ملیح آبادی

ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور دیگر مقامات کے اکابر شعراء ہمیشہ آتے جاتے رہتے اور دو چار مشہور شاعر تو ہمیشہ مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہی رہتے تھے۔ یہ تھا مسلسل چار پشتوں کا ادبی ماحول، اور پھر شمیم کی فطری شاعرانہ صلاحیتیں، ان دونوں نے مل جل کر شمیم کی شاعری کو اس طرح اُبھارا اور نکھارا کہ اُس نے شاعری کے اُس مقام سے ابتدا کی جو دوسری شعر گو خواتین کا نقطۂ انتہا ہوتا ہے۔

شمیم کو قدرت نے گھلا اور حساس دل عطا فرمایا ہے۔ وہ معمولی چیزوں سے بھی وہ اثر قبول کرتی ہے جو دوسرے غیر معمولی چیزوں سے بھی قبول نہیں کر سکتے؛

یہ بلا کی شدتِ احساس شمیم کی خوش قسمتی بھی ہے اور بدبختی بھی، اس سے شعر میں تو جان آجاتی ہے۔ لیکن دل کی جان نکل جاتی ہے۔

پیشِ نظر مجموعہ شمیم کی رباعیات پر مشتمل ہے۔ رباعی ایسی زہرہ گداز چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا، اور اچھے سے اچھے شاعروں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔ یہ کمبخت صنف موزونیٔ طبع شعری ذوق، ذہانت اور تخیّل کے بل بوتے پر قابو میں آنے والی چیز ہی نہیں، یہ نامراد رباعی تو مطالبہ کرتی ہے۔ ٹھوس تجربات، عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات کا، اور اس کے ساتھ ساتھ ظالم اس کا بھی حکم دیتی ہے۔ کہ شاعر اپنے افکار کے عطر کو ایسے نوک پلک کے قلیل الفاظ میں ادا کرے جس سے کثیر معنی اُجاگر ہو جائیں۔ اور جنونِ شاعرانہ اور عقلِ حکیمانہ کو اس انداز سے سمو دیا جائے جس

انداز کے ساتھ سنگم میں گنگا اور جمنا کے دھارے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔

شمیم کی عمر، اُس کے مشاہدات کی کمی اور (چوں کہ وہ چالیس سال سے بہت کم ہے) اس لئے

اُس کی چالیس سال سے پیشتر کی مُسلمہ دماغی خامی پر جب نظر ڈالتا ہوں اور اُسی کے دوش بدوش

جب اپنی عورتوں کی موجودہ عقلی و فکری سطح کو بھی دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے شمیم کی

رُباعیاں پڑھکر

یہ سب کیسے ہوا، یہ سب کیسے ہو سکتا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا لیکن یہ ایک ایسی حیرت

ہے جو موذی ہونے کے عوض، میرے دل و دماغ کو انتہائی مسرت کی موجوں سے شاداب کر دیتی ہے،

میری بچی کیسی اچھی رُباعیاں کہتی ہے جب یہ سوچتا ہوں تو مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے

یہ وہ خوشی ہے جس کا اظہار میرے کیا کسی کے بس کی بات نہیں۔

"آدمی محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں"

جوشؔ

۲۳ رنومبر ۱۹۵۱ء

دھلی
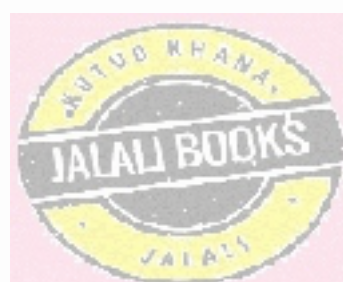
تعارف

عزیزہ سعیدہ صفیہ شمیم ملیح آبادی میرے دیرینہ دوست ہمعصر حضرت جوش ملیح آبادی کی حقیقی بھانجی ہیں۔ "علم و ادب" اس خاندان میں موروثی حیثیت رکھتا ہے۔ نواب فقیر محمد خاں گویاؔ مرحوم اپنے وقت کی ایک مسلّمہ تاریخی شخصیت کے مالک تھے۔ کیا بہ امتیازِ شرافت و نجابت، کیا بحیثیتِ امارت و ثروت۔

صفیہ شمیم سے مجھے متعدد بار ملنے کے مواقع ملے، اُن کے مزاج و سیرت کے متعلق اپنے تاثرات اجمالاً پیش کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ عزیزہ موصوفہ لکھنؤ سے تعلق رکھنے کے باوجود، پوری تہذیب اور مکمل شائستگی کے ساتھ ساتھ "تصنّع"، "تکلّف"، اور "فنّی اخلاق" سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں پاکیزگیِ نفس بلندیِ کردار کی حامل ہیں۔ فکر و نظر کے اعتبار سے بھی معمولی درجہ نہیں رکھتیں۔ اُن کے مزاج میں یک سر مشرقیت رچی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے شعر و ادب کا دائرہ محدود نہیں رکھتیں۔

یہی اُن کی مزاجی خصوصیات ہیں جو اُن کے کلام سے بھی، اُن کی شخصیت و انفرادیت اور شدید تاثرات کے ساتھ نمایاں طور پر محسوس ہوتی رہتی ہیں۔ فرصت نہیں کہ موصوفہ کے

کلام پر تفصیلاً کچھ لکھا جائے یا اُن کے کلام کے تدریجی تغیرات و مدارج پر ناقدانہ نظر کی جائے ۔

میں نے ان کے کلام میں فکر و جذبہ کا نہایت لطیف و دلفریب امتزاج پایا۔ وہ اصنافِ سخن میں سے ہر صنف پر پوری قدرت رکھتی ہیں۔ اور جو کچھ کہتی ہیں نہایت بے ساختگی و پرکاری کے ساتھ ۔

اے کاش میری مصروفیتوں میں اتنی کمی ممکن ہوسکتی کہ سیر حاصل کچھ لکھ سکتا۔ عزیزہ موصوفہ میری مصروف و منہمک زندگی سے باخبر ہیں۔ اس لئے مجھے توقع ہے کہ وہ مجھے صحیح معنوں میں معذور تصور کریں گی اور جو کچھ دوا دوی کے عالم میں قلم برداشتہ لکھ سکا اُسی کو قبول کر لیں گی ۔

جگر مراد آبادی

اپریل ۱۹۵۲ء

"چند لفظ اور"

یقیناً میرے لئے باعثِ فخر اور وجہ مسرت ہے کہ میں ایک قابل پاکستانی خاتون کے شُستہ کلام کے مُتعلق کچھ لکھوں لیکن اسے کیا کروں کہ میرے لئے کسی شاعر کے کلام پر دیباچہ لکھنا ایک مشکل کام ہے اور کلام سے لُطف اُٹھانا آسان۔

مُجھ سے کہا گیا ہے کچھ حرج نہیں۔ دو چار ہی جُملے لکھ دو سو میں حاضر ہُوں۔

جناب صفیہ شمیم صاحبہ ایک مُدت سے ہمایوں میں لکھتی ہیں۔ اور "ہمایوں" کو اُن کے کلام پر فخر ہے۔

رباعیات میں ہمیشہ ایک خاص دلکشی ہوتی ہے اور پھر جب زبان کی لطافت کے ساتھ خیالات کی بلندی بھی ہو۔ تو وہ سونے پر سہاگہ کا کام دیتی ہے۔

شمیم صاحبہ کی رباعیات میں زبان و خیال نے مل کر عجیب حُسن پیدا کر دیا ہے۔ اس مجموعے میں زندگی کے کئی مرقعے نظر آتے ہیں حکمت و عرفاں کی جھلکیاں بھی ہیں۔ اور تغزل کی چاشنی بھی ہے اور اس کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی برابر ملحوظِ خاطر ہے۔ ایک پاک نظر اور پاک دل خاتون سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شمیم صاحبہ اُمید اور رحمت کا پیغام دیتی ہیں۔ چنانچہ گریہ و تبسم کا یہ دلکش مجموعہ اس رُباعی سے شروع ہوتا ہے۔

پھولوں میں حیات تُل رہی ہے جاگو
جلووٗں کی بیاض کھل رہی ہے جاگو
بالائے زمیں برس رہے ہیں انوار
شب نورِ سحر سے دُھل رہی ہے جاگو
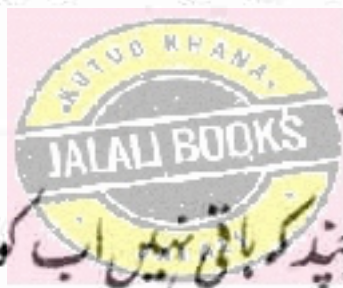
اور اس رُباعی پر ختم ہوتا ہے۔

ہر چند کہ باقی نہیں اب کوئی خوشی
آتی ہی نہیں بھول کے ہونٹوں پہ ہنسی
اس کشمکشِ یاس والم کے باوصف
مایوس نہیں ہوں تری رحمت سے ابھی

شاید یہ حال کے بعض دردناک واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

تاروں کی ہوئی محفلِ تاباں برہم
ہر سمت ہے چھایا ہوا غم کا عالم

سکتے میں ہیں بوستاں فضا ہے خاموش

بل بل کے گلوں سے رو رہی ہے شبنم

لیکن شاعرہ کا حساس دل اس درد والم سے مایوس ہو کر بھی مضمحل نہیں ہو گیا اور اس
کے بعد اگلی ہی رُباعی میں ہمیں یہ پیغام ملتا ہے۔

پھر نقش نئے ابھار دے گی فطرت

ذرہ ذرہ سنوار دے گی فطرت

مُرجھائے ہوئے چمن پہ گریاں کیوں ہو

پھر سے گلشن نکھار دے گی فطرت

پاکستان ایسی حوصلہ مند شاعرہ کا خیر مقدم کرتا ہے۔

بشیر احمد (مدیرِ "ہمایوں")
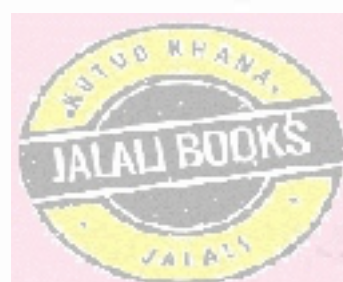
المنتظر

۲ر جنوری ۱۹۵۲ء

لاہور

رُباعیات
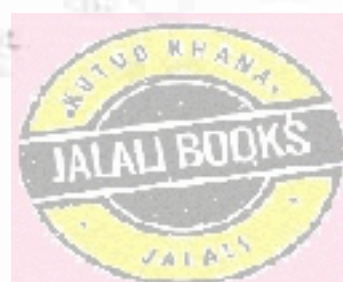
رباعی

اک عالمِ انوار ہے میرے دل میں
گنجینۂ اسرار ہے میرے دل میں
کھولوں جو زباں تو لعل و گوہر برسیں
وہ دولتِ بیدار ہے میرے دل میں

صفیہ شمیم ملیح آبادی
۱۸ر فروری ۱۹۵۳ء
راولپنڈی
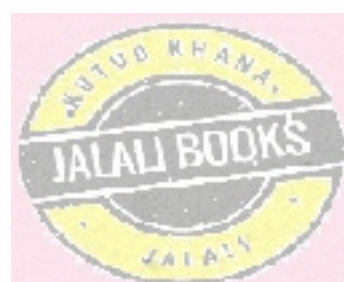
27

پھولوں میں حیات تُل رہی ہے جاگو
جلوؤں کی بیاض کھل رہی ہے جاگو
بالائے زمیں برس رہے ہیں انوار
شب نُورِ سحر سے دُھل رہی ہے جاگو
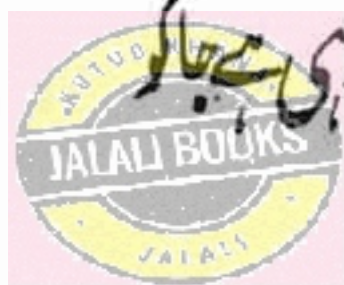
دِل میں ہے عجب خروش کس سے پُوچھوں
محدود ہیں عقل و ہوش کس سے پُوچھوں
فریاد ہے اے ذوقِ تجسّس فریاد
ہیں دیر و حرم خموش کس سے پُوچھوں

اُس نقشِ حسن پہ رُوحِ معانی قرباں
اُس پیاس پہ کوثر کی روانی قرباں
بخشی تھی حسینؓ کو مشیّت نے جو موت
اُس موت پہ عمرِ جاودانی قرباں
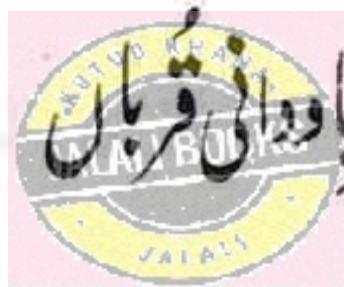
رُوحِ ایثار و جانِ ہمّت تھے حسینؓ
فخرِ کردار و نازِ غیرت تھے حسینؓ
اِنسان کی لازوال دولت کی قسم
اِنسان کی لازوال دولت تھے حسینؓ

جو بات یہاں ہوئی مُدلّل نہ ہوئی
مجمل ہی رہی کبھی مُفصّل نہ ہوئی
دُنیا نے ہزار رنگ بدلے اب تک
تصویر مگر کوئی مُکمّل نہ ہوئی

مانا کہ زمانہ خونچکاں ہے اے دل
ہر فرق پہ تلوار رواں ہے اے دل
بیماریٔ اِمروز سے رنجیدہ نہ ہو
یہ صحّتِ فردا کا نشاں ہے اے دل

بیدار ہوا عالمِ عُسرت ہُشیار
ہُشیار ہو پاسبانِ دَولت ہُشیار
سنکی چمنستاں میں وہ بادِ جمہور
تھرّائے وہ فانُوسِ امارت ہُشیار

قطرے کو تمنّا ہے گُہر بن جاؤں
کانٹے کو یہ دُھن ہے گُلِ تر بن جاؤں
سینے میں ہے ذرّے کے بھی اِک طرفہ خروش
اس ذوقِ طلب میں کہ قمر بن جاؤں

ہر سمت نئی آگ لگاتے رہیئے
سو رنگ سے انساں کو مٹاتے رہیئے
لب پر تو رہے نعرۂ امنِ عالم
اور امن کی بنیاد ہلاتے رہیئے
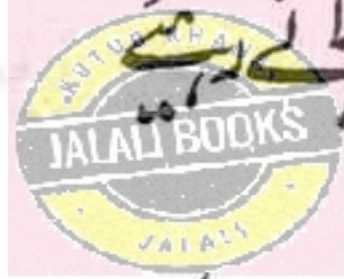
پھولوں کو صبا چڑھا رہی ہے پروان
نغموں سے ہے گلشن میں بپا اک طوفان
یہ جشنِ بہاراں نہیں اے اہلِ چمن
تجدیدِ خزاں کا ہو رہا ہے اعلان

کچھ بھی نہیں زندگی میں خدمت کے سوا
سوزِ دل و دردِ آدمیت کے سوا
اورنگ و نشان و چترِ مُہر و دیہیم
سب ہیچ ہے سب ہیچ محبت کے سوا

ہر صُبح کو سوگوار پایا ہم نے
ہر شام کو اشکبار پایا ہم نے
کانٹوں کا تو کیا ذکر ہے، گلشن میں شمیم
پھُولوں کو بھی دلفگار پایا ہم نے

ہر لحنِ طرب خیز ہے ماتم گویا
ہر پھول ہے اک دیدۂ پُرنم گویا
گُلشن میں بہار اب کی آئی کیسی
جنّت میں بھڑک اُٹھا جہنّم گویا
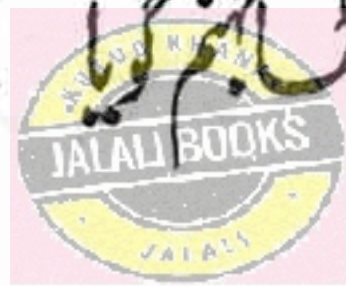
آزردہ و اشکبار جانا ہے ہمیں
اِس باغ سے دلفگار جانا ہے ہمیں
ممکن ہو تو کچھ اور کِھلا دے غنچے
کچھ دیر میں اے بہار جانا ہے ہمیں

دُنیا ہے مجاز، اور حقیقت ہُوں مَیں
تابندگیِ صبحِ سعادت ہُوں مَیں
ہر ایک نَفَس میرا پیامِ اُلفت
دوزخ میں مہکتی ہوئی جنّت ہُوں مَیں
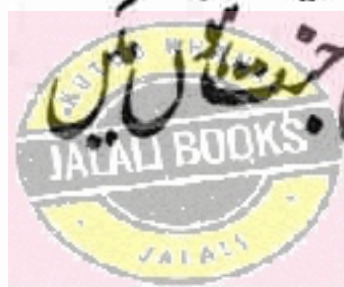
یہ جلوہ گہِ حُسنِ سعادت ہے، کہ دل
سرچشمۂ انوارِ حقیقت ہے، کہ دل
اے خالقِ آب وگِل بتا دے اِتنا
یہ کشمکشِ دردِ محبّت ہے، کہ دل

اربابِ ہنر کہاں ہیں، کس سے پوچھوں
اصحابِ خبر کہاں ہیں، کس سے پوچھوں
جو گوہرِ اشعار پہ کھتے تھے شمیم
وہ اہلِ نظر کہاں ہیں، کس سے پوچھوں
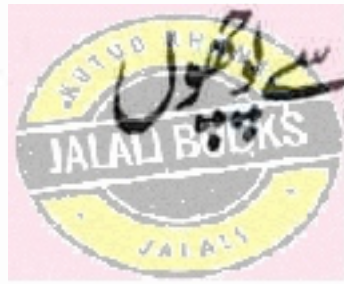
جو صبح ہے روپوش ہوئی جاتی ہے
جو شام ہے غم کوش ہوئی جاتی ہے
کیسی یہ ہوا چلی ہے کس سے پوچھوں
جو شمع ہے خاموش ہوئی جاتی ہے

تپتے ہوئے نغموں کی نہ ہوتی ایجاد
نغموں میں نہ گونجتی غموں کی روداد
برباد دلوں کو عشق کرتا نہ اگر
ہوتا نہ کبھی عالمِ امکاں آباد
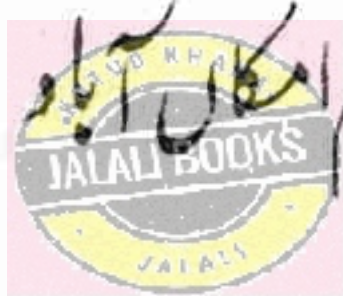
کیوں درد کو درماں سے نہ بڑھکر سمجھوں
کیوں اشکِ تمنّا کو نہ گوہر سمجھوں
یہ لذّتِ رُوح ہے وہ تسکینِ حیات
کیوں غم کو مسرّت سے نہ بہتر سمجھوں

کیا عقدۂ شعر کھول سکتا ہے کوئی
دربارِ سخن میں بول سکتا ہے کوئی
نقادِ سخن سے کوئی جا کر پوچھے
کیا بوئے سمن کو تول سکتا ہے کوئی
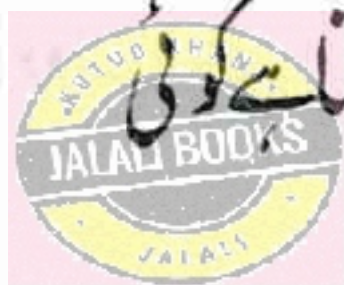
اک عالمِ انوار ہے میرے دل میں
گنجینۂ اسرار ہے میرے دل میں
کھولوں جو زباں تو لعل و گوہر برسیں
وہ دولتِ بیدار ہے میرے دل میں

آتی ہے تو آنے دو ہوائے آلام
ہاں نغمۂ عشرت ہے صدائے آلام
مضمر ہے نشاطِ رُوح سوزِ غم میں
اب درد ہی بن چکا دوائے آلام
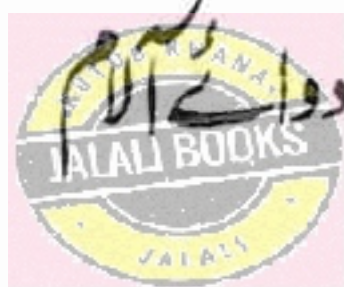
دانائے جہاں کہاں ہیں، کس سے پوچھوں
یکتائے زماں کہاں ہیں کس سے پوچھوں
کوثر سے زباں دُھلی ہوئی تھی جن کی
وہ اہلِ زباں کہاں ہیں، کس سے پوچھوں

اب دل کی خلش کا ہو رہا ہے آغاز
گُل کر دو یہ فانُوس، اُٹھا دو یہ ساز
اے نغمہ گرانِ بارگاہِ عشرت
خاموش کہ ماضی کی وہ گُونجی آواز

طاری ہے ہنُوز خوابِ غفلت دل پر
وَا ہو نہ سکا بابِ حقیقت دل پر
روشن ہے نہ جانے کب سے شمعِ دانش
ظُلمت کی ابھی تک ہے حکومت دل پر

کیا تجھ کو خبر ہے اے نگارِ دلجُو
بدلے ہیں مری وفا نے کیا کیا پہلُو
اِک صرف تری خوشی کی خاطر میں نے
سانچے میں تبسُّم کے ہیں ڈھالے آنسو
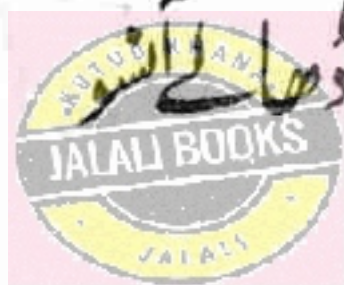
یہ عالمِ صحّت ہے، کہ بیماری ہے
اب غم ہے مسلّط، نہ خوشی طاری ہے
اللہ یہ کیا حال ہوا جاتا ہے
اب نیند ہے قسمت میں نہ بیداری ہے

اے سینۂ گردوں کے شرارو ٹھہرو

ڈھلتی ہوئی رات کے ستارو ٹھہرو

آنکھوں سے ابھی تو بہہ رہے ہیں آنسو

اے ڈوبتے غمناک ستارو ٹھہرو

گلشن میں بہاروں نے جگائے جادو

یہ پھول، یہ دریا، یہ چمن، یہ خوشبو

اے بادِ بہار جا کے اُن سے کہنا

آجاؤ کہ تھمتے نہیں اب تو آنسو

اُمّید نے پھر دُھوم مچائی دِل میں
پھر شمعِ نشاط جگمگائی دِل میں
یُوں ناز سے کوئی مسکراتا آیا
گویا شبِ ماہ مُسکرائی دِل میں

اے شوق کی کائنات واپس آجا
اے روشنیِ حیات واپس آجا
پھر صُبحِ جنوں طُلوع کر دے دل میں
باقی ہے خرد کی رات واپس آجا

ہنسنے لگی پھولوں کی صباحت دل میں

کچھ آئی شگوفوں کی لطافت دل میں

یوں آج کسی کی یاد آئی گویا

گُل بیز ہوئی صُبحِ محبّت دل میں
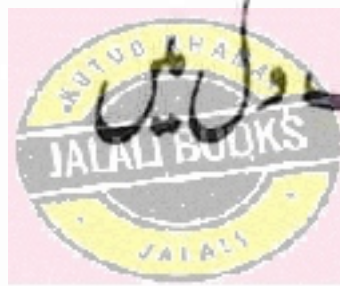
باغوں پہ برستے ہوئے چھائے بادل

پیغامِ بہار و کیف لائے بادل

اشکوں کو ترس رہی تھیں آنکھیں میری

صد شکر رلانے کو پھر آئے بادل

خوشبو میں نہا رہا ہے ساون آجا

غنچوں کو ہنسا رہا ہے ساون آجا

چھائی ہیں مرے دل پہ گھٹائیں غم کی

رہ رہ کے رُلا رہا ہے ساون آجا
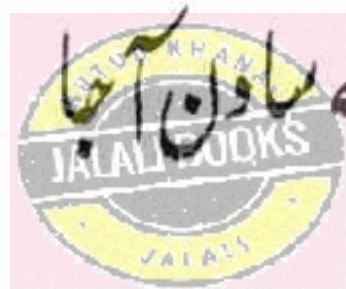
یوں پھول تمنا کے کھلاتی تھی خوشی

پیغامِ بہارِ نو سُناتی تھی خوشی

گلشن میں اس انداز سے آتا تھا کوئی

ہنستی تھی بہار، مُسکراتی تھی خوشی

کھولا ہے بہار نے فضا میں پرچم
بوندوں کی صدائیں آ رہی ہیں پیہم
کچھ تجھ کو خبر ہو تو بتا دے ساون
آنکھیں ہوئی جاتی ہیں مری کیوں پُرنم

پھر دل کے چمن میں مسکرائے گی کبھی؟
پھر غنچۂ اُمید کھلائے گی کبھی؟
جاتی ہے تو جا صبحِ بہاراں، لیکن
اتنا تو بتائے جا پھر آئے گی کبھی؟

رُخسار پہ تازہ دم بہاروں کی پیرو
ہونٹوں پہ ہے زرفشاں تبسّم کی ضَو
ہنستا ہوا گلشن میں دَر آیا ہے کوئی
یا سینۂ گلشن سے نکل آئی ہے ضَو

کھلتا نہیں کچھ رازِ محبّت ہے کہ دل
یہ پرتوِ انوارِ حقیقت ہے، کہ دِل
رہ رہ کے دھڑکتا ہے جو پہلو میں شمیمؔ
یہ سینۂ ہستی کی امانت ہے کہ دل

دھو میں ہیں چمن فضا ہے گُل پوش
جنت کا کھُلا ہوا ہے گویا آغوش
چھیڑا ہے جنوں نے سازِ شیریں اپنا
خاموش ہوا ہے عقل کے بند و خاموش
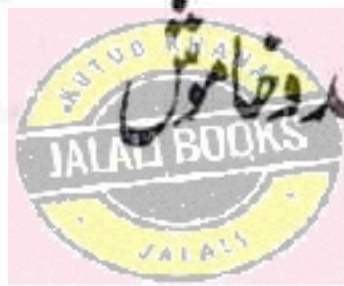
اب مِل گئی آلام سے دِل کو فرصت
آرام کی خواہش نہ تلاشِ عشرت
اندیشۂ فردا ہے نہ فکرِ امروز
جب سے ہے تری یاد سے دِل کو نسبت

فانوسِ حقیقت کے جلا دیتا ہے

دِل عالمِ فانی سے ہٹا دیتا ہے

عرفانِ غمِ عشق جسے کہتے ہیں

اللہ سے بندے کو ملا دیتا ہے
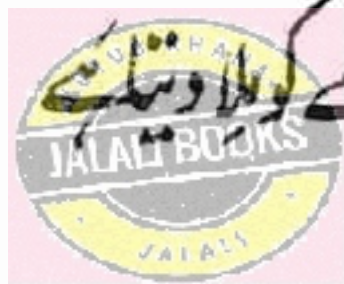
آتا نہیں جب نظر ستارا مجھ کو

ملتا نہیں طوفاں میں کنارا مجھ کو

رہتا نہیں جب کوئی سہارا باقی

دیتا ہے ترا درد سہارا مجھ کو

طوفان میں کشتی کو بڑھاؤں کیسے
آندھی میں چراغِ دل جلاؤں کیسے
یہ سیلِ حوادث، یہ ہجومِ آفات
اللہ یہ بارِ غم اٹھاؤں کیسے
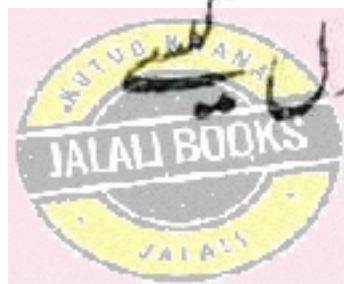
ہر ذرّہ مسرّت سے جواں ہے اے دل
سرشارِ دلِ کون و مکاں ہے اے دل
نغمے یہ ہواؤں کے یہ بوندوں کے ستار
اِس وقت نہ جانے وہ کہاں ہے اے دل

یہ کیف، یہ تازگی یہ خوشبو یہ نمی
نزہت سے تری کھل گئی اس دل کی کلی
اے موجِ نسیم سچ بتا دے کیا تو
چھو کر رُخِ محبوب کو آئی ہے ابھی؟
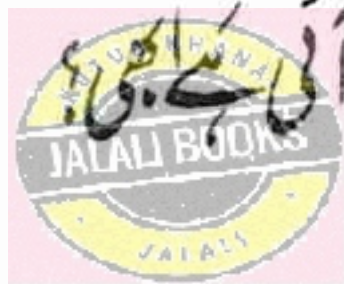
ویراں ہی رہا دِل کا گلستاں افسوس
روشن نہ ہوئی شمعِ شبستاں افسوس
آنا تھا نہ وہ عہد فراموش آیا
اور بیت گیا موسمِ باراں افسوس

اے رُوحِ سخن، جانِ تکلّم آجا
ہونٹوں پہ لئے موجِ ترنّم آجا
مُدّت سے تجھے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
اے جانِ قسم، رُوحِ تبسّم آجا
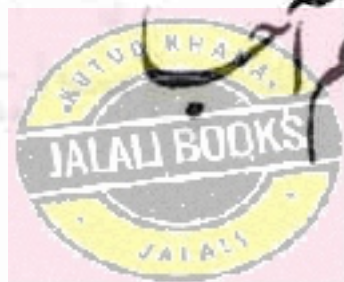
ہر پھُول یہاں غرقِ تبسّم تھا کبھی
ہر غُنچہ یہاں محوِ ترنّم تھا کبھی
ہاں یہ وہی گلشن ہے جہاں شام و سحر
تانیں تھیں ترانے تھے تلاطُم تھا کبھی

گلشن کی ہر اک کلی چٹک جاتی ہے
پیشانیٔ آفاق دمک جاتی ہے
اس ناز سے کچھ وہ مسکرا دیتے ہیں
گلزار میں چاندنی چھٹک جاتی ہے

ہاں وقت نقوشِ غم مٹا ہی جاتا
جینے کی کوئی شکل بتا ہی جاتا
بیکار کرم کیا جو آئے سرکار
اک دن تو قرارِ دل کو آ ہی جاتا

گلشن میں خزاں ہے جلد آنے والی
روئیں گی فضائیں مسکرانے والی
ہنس لو کوئی دم اور شگوفو ہنس لو!
کچھ دیر میں ہے بہار جانے والی
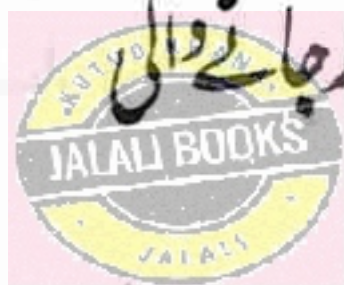
یہ رنگ شگوفوں کا یہ شبنم کی ضو
یہ عارضِ گلشن پہ تبسم کی رَو
تو عالمِ انوار سمجھتا ہے جسے
یہ تو ہے ترے حُسنِ نظر کا پرتو

یہ سر سرِ آفات گذر جائے گی
یہ غم کی سیہ رات گذر جائے گی
آئے گا پیامِ صبحِ خنداں اِک روز
اشکوں کی یہ برسات گذر جائے گی
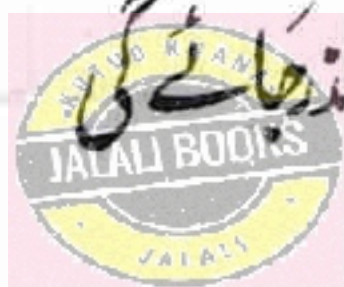
وہ ابرِ کرم کہاں ہے کس سے پوچھوں
وہ جام وہ جم کہاں ہے کس سے پوچھوں
ہر پھول میں جس کے مسکراتی تھی بہار
وہ باغِ ارم کہاں ہے کس سے پوچھوں

کلیوں پہ ہے ضَو فشاں تبسّم آجا
گُلشن میں ہے نغموں سے تلاطم آجا
سُونی ہے ترے بغیر دل کی دُنیا
اے جانِ طرب، رُوحِ ترنُّم آجا
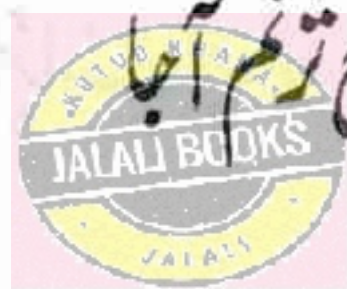
ہوتی نہ کبھی فضائے گُلشنِ گُل بار
آتا نہ گلستاں میں شگوفوں پہ نکھار
ہوتے نہ جو نغمہ بار ہم دُنیا میں
ہنستی نہ عروسِ صُبح، گاتی نہ بہار

اِس بزم سے جانے کب اُٹھا دے ہم کو

کس وقت بیاباں سے صدا دے ہم کو

کیوں باندھتے ہو عہدِ وفا اہلِ جہاں!

کیا جانئے کب موت چھڑا دے ہم کو
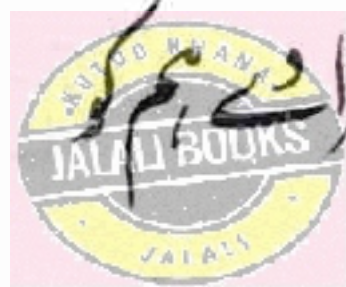
ہر خواب کو جھُٹلا کے گذر جا اے دل

اوہام سے کترا کے گذر جا اے دل

آئیں گے نئے موڑ پہ لاکھوں خورشید

ذرّات کو ٹھکرا کے گذر جا اے دل

باقی نہ رہا کوئی اُمیدوں کا نِشاں
کچھ ہو گئی یُوں بزمِ تمنّا ویراں
افسوس کہ اب موجِ چراغاں کے عوض
غلطیدہ ہے دِل میں شمعِ کشتہ کا دُھواں
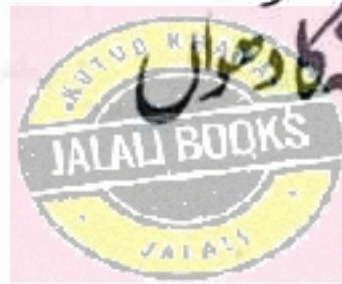
ہر صُبح ہے میرے لئے اِک رمزِ دقیق
ہر رات ہے دِل کے لئے اِک رازِ عمیق
اُف خندۂ گُل بھی اب ہے اِک ضربِ شدید
اِتنا بھی نہ دِل کسی کا یارب ہو رقیق

ہر صبحِ طرب خیز رُلاتی ہے مجھے
ہر شام حدیثِ غم سُناتی ہے مجھے
اُس بھولنے والے سے صبا کہہ دینا
بیدرد تری یاد ستاتی ہے مجھے
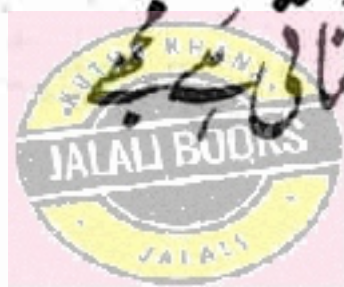
چہرے پہ وہ اشکوں سے سحر کا عالم
شبنم کا سماں نجم و قمر کا عالم
وہ یاس وہ حسرت وہ تمنّا وہ ہراس
وہ وقتِ سفر اُن کی نظر کا عالم

اے چشمۂ انوارِ سحر واپس آ

اے تابِ گہر، نورِ قمر واپس آ

تاریک ہے نظروں میں زمانہ سارا

تابندگیِ قلب و نظر واپس آ
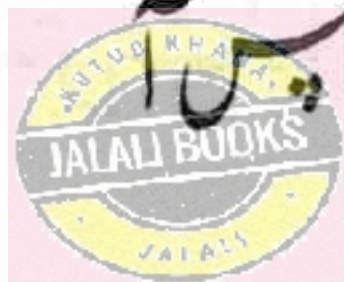
ہر پھول کے رُخ پر ہے قمر کا پرتَو

غلطیدہ ہے شبنم میں گہر کا پرتَو

اے رُوحِ جمال تُو کہاں ہے آ جا

رقصاں ہے گلستاں پہ سحر کا پرتَو

فطرت بربط بجا رہی ہے گویا
کلیوں کو صبا کھلا رہی ہے گویا
یہ کس کی صدا گونج رہی ہے دل میں
برسات چمن میں گا رہی ہے گویا
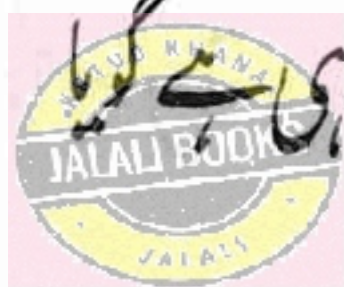
گلشن میں ہیں انوارِ سحر ولولہ خیز
سرشار ہے بوستاں، فضائیں گل بیز
اس عالمِ کیف میں خدا جانے کیوں
اشکوں سے ہوئی جاتی ہیں آنکھیں لبریز

تقدیرِ گہر جاگ اُٹھی ہے گویا

تنویرِ قمر جاگ اُٹھی ہے گویا

مکھڑے کی یہ سُرخیاں تبسّم کی یہ ضَو

جنّت میں سحر جاگ اُٹھی ہے گویا
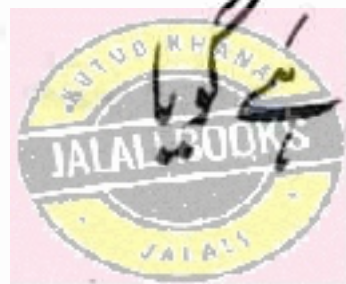
اے دوست چمن میں گنگناتا ہوا چل

ہر گام پہ سَو پھول کھلاتا ہوا چل

پیمانۂ عمر ہو رہا ہے خالی

پیمانۂ سرخوشی لنڈھاتا ہوا چل

رُخسارِ مَلیح پر سحر کے آثار
سرشار نگاہوں میں تبسّم بیدار
یہ وقتِ سحر کون چمن میں آیا
ہر غنچۂ شاداب ہے جنّت بہ کنار

پُر کیف یہ لمحات الٰہی توبہ
یہ جھومتی برسات الٰہی توبہ
دل فرطِ مسرت سے نہ رُک جائے کہیں
یہ شوقِ ملاقات الٰہی توبہ

کلیوں کو صبا کھلا رہی ہے آجا
گلشن کو سحر جگا رہی ہے آجا
اے دوست یہ رُت پھر نہ کبھی آئے گی
ایسے میں بہار گا رہی ہے آجا
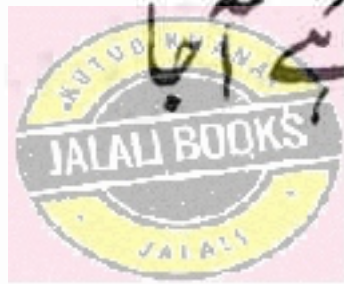
اُمڈی ہوئی بدلیاں ہیں جنگل سنسان
ہے سُرمئی شام دُھندلے میدان
اے رُوحِ بہار تو کہاں ہے آجا
فُرقت میں تری دیدہ و دل ہیں ویران

بجھتی ہوئی شمعِ شادمانی توبہ

تاریکیِ شامِ زندگانی توبہ

غرقاب نہ ہو جائے کہیں کشتیِ دل

طوفانِ حوادث کی روانی توبہ
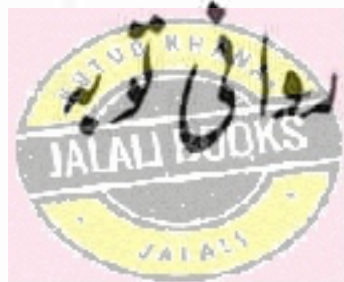
بس تاب نہیں اب نہ رُلانا لِللہ

رہ رہ کے مرادِل نہ دکھانا لِللہ

تم آ نہیں سکتے ہو نہ آؤ، لیکن

اب یاد بھی تم مجھے نہ آنا لِللہ

چھیڑے ہیں مسرّت کے ترانے کیا کیا
یاد آتے ہیں عشرت کے زمانے کیا کیا
کیا تجھ سے کہیں قصّۂ ماضی ہمدم
خوابیدہ ہیں اس دل میں فسانے کیا کیا
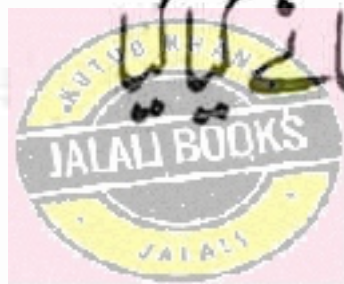
پہلا سا نہیں کوئی قرینہ اپنا
بشکستہ ہے اب دل کا نگینہ اپنا
خاموش ہیں موجیں تو ہوائیں ساکت
طوفان کا طالب ہے سفینہ اپنا

پھر محفلِ تخیّل کو آباد کریں
پھر تازہ حدیثِ دلِ ناشاد کریں
پھر چھیڑ دیں آؤ داستانِ ماضی
بھولی ہوئی محفلوں کو پھر یاد کریں

وہ رونقِ جوئے بار آتا ہو گا
وہ زینتِ لالہ زار آتا ہو گا
کُمھلاؤ نہ اُمیّد کے غنچو ٹھہرو
وہ پیکرِ نو بہار آتا ہو گا

پھر جھوم رہے ہیں سر پہ بادل، تھم جا
گونجے ہوئے نغموں سے ہیں جنگل، تھم جا
یہ پھول، یہ دریا، یہ شگوفے، یہ بہار
اے لمحۂ تیز گام اک پل تھم جا
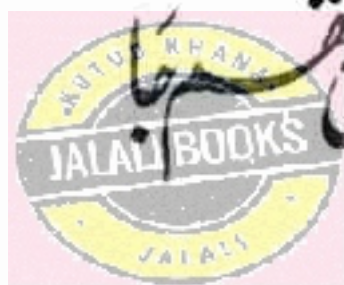
گلشن کو جمالِ صبحِ جنّت دے دے
سرمایۂ آب و رنگ و نکہت دے دے
آ پھر اُسی انداز سے حُسنِ خنداں
کلیوں کو چٹکنے کی اجازت دے دے

پھر ماہِ تمام ضَو فشاں ہے آجا
پھر حسرتِ کونین جواں ہے آجا
پھر سینۂ گلشن سے اُبلتی ہے بہار
پھر چشمِ تمنّا نگراں ہے آجا
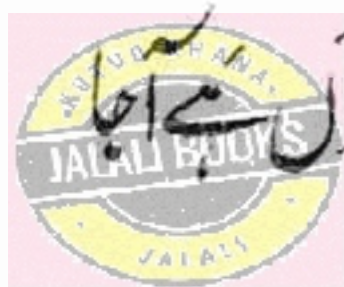
یہ حُسن کا حال کوئی دیکھے تو ذرا
بے وجہ ملال کوئی دیکھے تو ذرا
خود ہی مجُرم ہیں اور خود ہی برہم
یہ شانِ جلال کوئی دیکھے تو ذرا

راتیں ہیں اُداس اُداس صُبحیں بے آب
مُدّت سے غمِ ہجر سے دِل ہے بیتاب
اے بادِ نسیم اگر ملیں وہ تجھ کو
کہنا کہ ہیں اِک عمر سے آنکھیں بے خواب

شیرازہ مسرّت کا بِکھر جاتا ہے
دِل شدّتِ حِرماں سے ٹھہر جاتا ہے
جس وقت ترا خیال آتا ہے مجھے
نشتر سا کلیجے میں اُتر جاتا ہے

لہجے میں یہ بوندوں کی ملائم کھنکار
یہ کیف، یہ نرمی، یہ ترنّم، یہ نکھار
آواز کا یہ ساز کہ جیسے سرِ شام
کہسار میں پڑ رہی ہے نغموں کی پھوار
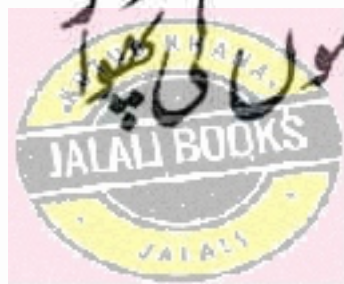
غلطاں ہیں ہزار ہا سویرے دل پر
حوریں ڈالے ہوئے ہیں ڈیرے دل پر
کلیوں پہ ٹپک رہی ہیں رس کی بوندیں
یوں بارشِ الہام ہے میرے دل پر

ہر سمت فضاؤں پہ ہے اِک عالمِ نُور
سرشار ہیں بُوستاں، صبا ہے مَسرُور
نکھری نکھری سی ہے جبینِ فطرت
اِس باغ میں کوئی مُسکرایا ہے ضرُور
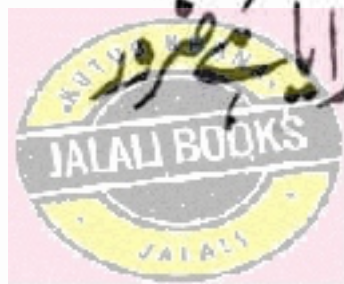
کروٹ نہ زمانہ یوں بدلتا اے کاش
شب رہتی کبھی دن نہ نکلتا اے کاش
طُوفان غموں کا ایک ایسا آتا
دل ڈوب ہی جاتا نہ سنبھلتا اے کاش

آسودۂ زیست ہوں کہ آزردہ ہوں
سرشارِ نشاط ہوں کہ افسردہ ہوں
افسوس کہ اِتنا بھی نہیں اب معلوم
زندہ بھی ہوں میں شمیمؔ یا مُردہ ہوں
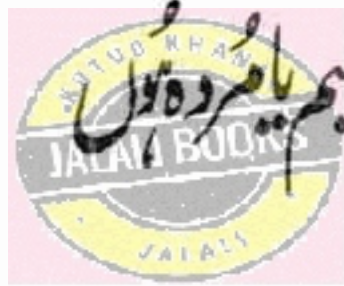
اک وہم ہے زندگی اشارا ہے اجل
مایوس دِلوں کا اک سہارا ہے اجل
اِس کشمکش سیلِ حوادث کی قسم
طوفان ہے زندگی کنارا ہے اجل

انجامِ وفا سے دل کو افگار نہ کر

بے ہوش کو اے ندیم ہُشیار نہ کر

مانا کہ محبّت ہے سراسر اک خواب

پھر بھی مُجھے اس خواب سے بیدار نہ کر
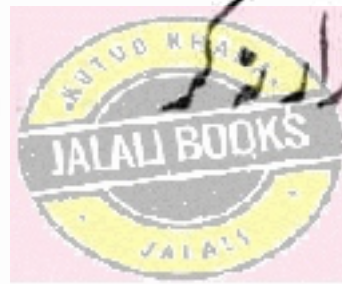
محرومِ طرب ہو کے بھی محرومِ نہیں

جلوے مری نظروں سے وہ معدُوم نہیں

اے دوست ترے دردِ محبّت کی قسم

دل رنج میں بھی شاد ہے مغمومِ نہیں

اب شکل نہ لِلّٰہ دکھانا دیکھو!

اب اور نہ دیوانہ بنانا دیکھو!

جاتے ہو تو ہاں شوق سے جاؤ لیکن

بھولے سے بھی اب یاد نہ آنا دیکھو!
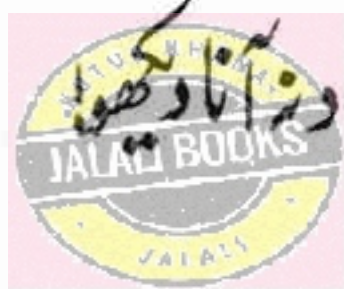
یہ ختم جُدائی کی کبھی رات نہ ہو

اشکوں کی کبھی بند یہ برسات نہ ہو

مِٹ جائے نہ یہ لذّتِ اندوہ شمیمؔ

بہتر ہے یہی اُن سے مُلاقات نہ ہو

جب صُبح گلستاں کو جگاتی ہے شمیمؔ
جب بادِ صبا پُھول کِھلاتی ہے شمیمؔ
جب باغ میں ہنستی ہے گلوں پر شبنم
رہ رہ کے کسی کی یاد آتی ہے شمیمؔ
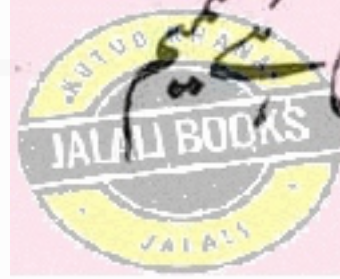
ہو جائے نہ دِل مرکزِ آلام کہیں
یہ سعیِ سکوں بھی نہ ہو ناکام کہیں
ہر آن یہی خوف ہے وہ توڑ نہ دے
یہ سلسلۂ نامہ و پیغام کہیں

اب غنچۂ احساس مہکتا ہی نہیں
سیّارۂ افکار دمکتا ہی نہیں
ہر چند ہے ضَو بار فضائے عالم
رُخسارۂ تخیُّل جھمکتا ہی نہیں
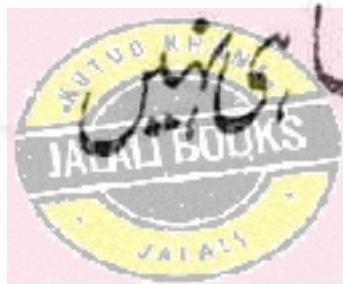
نامہ ہے نہ پیغام نہ غمخواری ہے
کیسی یہ محبت کی ستمگاری ہے
دل سے جو کبھی ناز اٹھاتے تھے شمیمؔ
اب اُن کو مرے نام سے بیزاری ہے

اے مونس و دلسوز کہاں جاتا ہے

اے نورِ شب و روز کہاں جاتا ہے

دیرینہ تمنّاؤں کے گُل کر کے چراغ

اے حسنِ دل افروز کہاں جاتا ہے
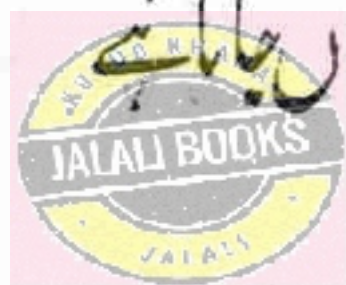
دکھیوں پہ جو انساں ہیں ترس کھاتے ہیں

گھبرائے ہوؤں کو نہیں گھبراتے ہیں

بیزار ہو کیوں گلے تو مِل لینے دو

جاتے ہیں اب اے اہلِ وطن جاتے ہیں

اِحساس کا ہر نقش مٹا دیتے ہیں

اُمّید کی ہر شمع بُجھا دیتے ہیں

جِس باغ میں ہوتے ہیں شگوفے خنداں

اُس باغ میں لوگ آگ لگا دیتے ہیں
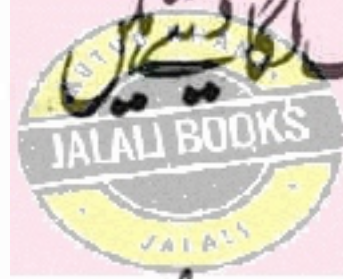
فانُوسِ قمر زرد ہوا جاتا ہے

آفاق کا دل سرد ہوا جاتا ہے

یہ پچھلے پہر کس نے ترانہ چھیڑا

عالم ہمہ تن درد ہوا جاتا ہے

جب دِل پہ صدی غم کی گذر جاتی ہے
برسوں شبِ ہجر خون رُلواتی ہے
اِس کارگہِ رنج میں بھولی بھٹکی
تب ایک مسرت کی گھڑی آتی ہے
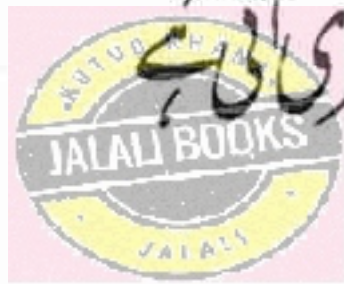
ہر ذرّے پہ ثبت ہے حدیثِ عبرت
ہر سمت برس رہی ہے یاس و حسرت
غنچے میں نہ شمع ہے نہ بوئے گل ہے
یہ خستہ شمیم کی ہے شاید تربت

ہر چند ہے تاریک سرائے ہستی
گو لاکھ ہے بے کیف ہوائے ہستی
اے شمعِ اُمید اے چراغِ دل و جاں
روشن ہے ترے دم سے فضائے ہستی
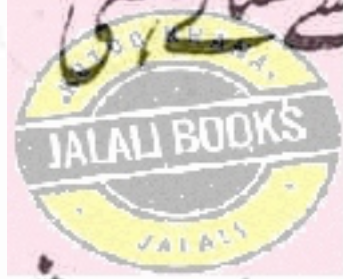
کیا مطربِ شوق گن گنائے گا کبھی
کیا وقت خوشی کے گیت گائے گا کبھی
اے گردشِ روزگار اتنا تو بتا!
واپس بھی وہ گلعذار آئے گا کبھی!؟

اے خامِ جہاں کے پُختہ کارو جاگو

اے نوعِ بشر کے غمگسارو جاگو

بجنے ہی پر اب ہے پل میں نقّارہِ جنگ

اے امن داماں کے دوستدارو جاگو
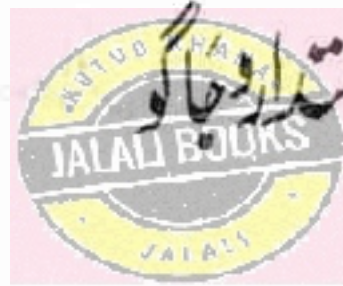
کس طور سے دیکھ جی رہا ہے اِنساں

خود اپنے کفن کو سی رہا ہے اِنساں

کیا تُجھ کو بھی معلوم ہے اے ربِّ جلیل

اِنسان کا خُون پی رہا ہے اِنساں

تاریکیِ شب میں نُور افشاں ہو جا
دردِ دلِ کونین کا درماں ہو جا
کُھل جائیں گے در ہائے مسرّت دل پر
اُٹھ اور شریکِ غمِ انساں ہو جا

ہر پست و بلند کھو گیا ہے تُجھ میں
انساں کا غُرور سو گیا ہے تُجھ میں
اے خاک تری بزم ہے کتنی دلکش
آیا نہ پلٹ کے جو گیا ہے تُجھ میں

جی غم سے عرق عرق ہوا جاتا ہے

اُمّید کا چہرہ فق ہوا جاتا ہے

احباب کسے لے کے چلے ہیں سوئے گور

اے موت کلیجہ شق ہوا جاتا ہے
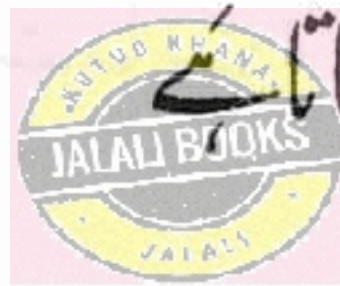
ساز ہستی بجا رہا ہے کوئی

روز اک نئی دھج دکھا رہا ہے کوئی

کونین کو ہر بار مٹانے کے لئے

کیا کیا عالم بنا رہا ہے کوئی

بُنیادِ تقدّس کی مٹانے والو!
اے پیٹ پہ ایمان گنوانے والو!
اِس آتشِ حرص پر تو چھڑکو پانی
اے آتشِ دوزخ سے ڈرانے والو!
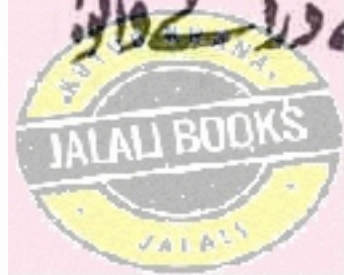
ہنگامۂ آلام سے نالاں کیوں ہے
طوفانِ حوادث سے ہراساں کیوں ہے
دُنیا کبھی دوزخ تو کبھی ہے جنّت
نیرنگیٔ عالم سے پریشاں کیوں ہے

ہمّت ہے تو ہر گام پہ نُصرت ہوگی
قدموں پہ ترے شوکت و عظمت ہوگی
اس وقت اگر تجھ سے گریزاں ہے تو ہو
کل وقت کو خود تری ضرورت ہوگی
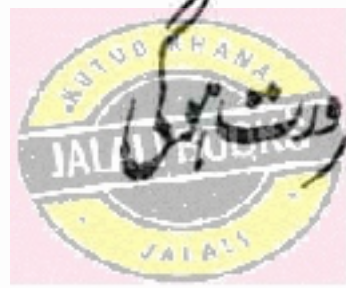
اے دل کی سعادتوں کو کھونے والو!
ہر سانس میں تُخمِ ظُلم بونے والو!
معلُوم بھی ہے جاگ رہا ہے معبُود
اے مخمل و سنجاب پہ سونے والو!

آنسو کی طرح پل میں ڈھلک جاتی ہے
بجلی کی طرح دم میں لپک جاتی ہے
یہ عمر ہے وہ شراب اہلِ ہستی
پل بھر میں جو ساغر سے چھلک جاتی ہے
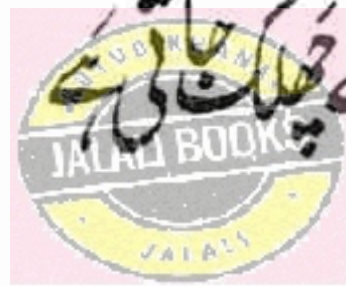
اُٹھ دولتِ عزّ و جاہ مِل جائے گی
منزل گہہِ مہر و ماہ مِل جائے گی
کر اوج نگاہ و دل میں پیدا پہلے
عرفانِ خودی کی راہ مِل جائے گی

بزمِ علم و نظر لرز جاتی ہے
لو مشعلِ ادراک کی تھرّاتی ہے
اللہ ری تاریکیٔ شامِ اوہام
ہر گام پہ عقل ٹھوکریں کھاتی ہے

معراجِ نشاط و کامرانی ہے یہی
سرمایۂ کیف و شادمانی ہے یہی
کیوں موت کے نام سے لرز اٹھتا ہے
نادان کمالِ زندگانی ہے یہی

شمعِ ہستی بجھا رہا ہے اِنساں
اِنساں کا لہو بہا رہا ہے اِنساں
خلّاقِ جہاں سے کوئی کہہ دے اے کاش
تخریب کی سمت جا رہا ہے اِنساں

کونین کا دردمند ہو جا اے دِل
غمِ زیست سے غم پسند ہو جا اے دِل
گم کردہ تمنّاؤں کی ظُلمت سے نکل
پستی سے اُبھر بلند ہو جا اے دِل

سرمایۂ صد عیش و مسرت ہے یہی
جس کے لئے مضطر ہے وہ جنت ہے یہی
ہے نعمتِ بے حساب قلبِ شاکر
جو ختم کبھی نہ ہو وہ دولت ہے یہی
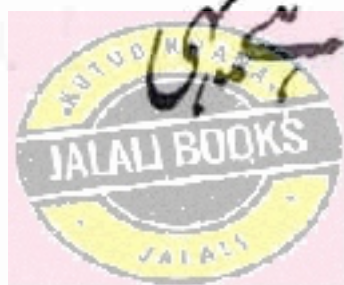
طاقت سے ڈرو نہ شان و شوکت سے ڈرو
آفات سے کانپو، نہ ہلاکت سے ڈرو
گھبراؤ نہ دشمنوں کی خوئے بد سے
احباب کے دعوئِ محبت سے ڈرو

سازِ فطرت پہ گنگنائی تھی کبھی!؟
گلشن میں عروس بن کے آئی تھی کبھی!؟
اے خاک پہ بکھری ہوئی پژمردہ کلی!
کیا تو بھی چمن میں مسکرائی تھی کبھی!؟
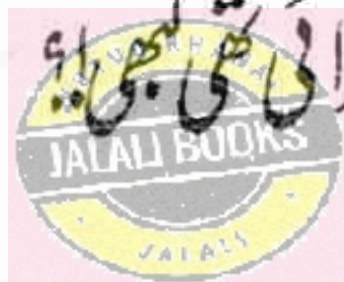
وہ محملِ رنگ و بو سے لیلیٰ نکلی
مینا سے تڑپ کے روحِ صہبا نکلی
نکلی وہ شمیمِ گل قبائے گل سے
یا سینۂ گلشن سے تمنّا نکلی

پھر دِل کے چمن میں مُسکرائے گی کبھی؟
پھر غنچۂ اُمّید کھلائے گی کبھی؟
جاتی ہے تو جا، صبحِ بہاراں، لیکن
اِتنا تو بتائے جا پھر آئے گی کبھی؟
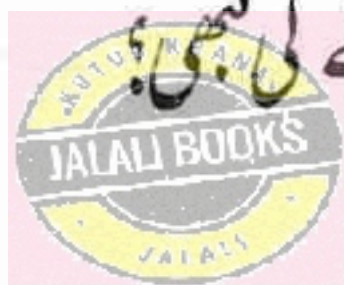
جب حد سے سوا ملال ہوتا ہے مجھے
ہر ایک نَفَس وَبال ہوتا ہے مجھے
باقی نہیں رہتی کوئی جب دِل میں اُمید
وہ سامنے ہیں خیال ہوتا ہے مجھے

کیا نالہ و فریاد کیا کرتا ہے؟
دِل درد سے آباد کیا کرتا ہے؟
اُس دورِ طرب خیز میں اے بادِ صبا!
ہم کو بھی کوئی یاد کیا کرتا ہے؟
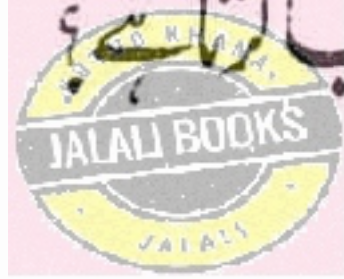
پَر تول رہا ہے نُورِ ماہِ کامل
سُرخی ظُلمت میں ہو رہی ہے شامل
جُنبش میں ہے یُوں قطرۂ شبنم گُل پر
ناشاد کا جس طرح دھڑکتا ہوا دل

دستِ و پا میں حنا لگا لینے دے

پوشاک تو پھولوں میں بسا لینے دے

اے بادِ خزاں ایک نفس کی مُہلت

موسم کی دُلھن کو مُسکرا لینے دے
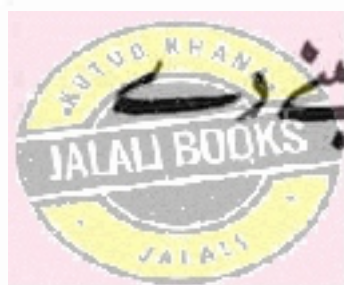
یہ پھُول، یہ گُلشن، یہ گھٹائیں، یہ بہار

کلیوں کی یہ تازگی یہ غنچوں کا نِکھار

یہ ساغرِ گُل یہ ہے کھنک بُوندوں کی

یا حُور نے فردوس میں چھیڑا ہے ستار

۴

اُٹھ غنچۂ دِل صبا کھلائے گی ضرور
پھر لیلیِٰ انبساط آئے گی ضرور
کیوں اے دِلِ مایوس بُجھا جاتا ہے
پھر صُبحِ اُمید مُسکرائے گی ضرور
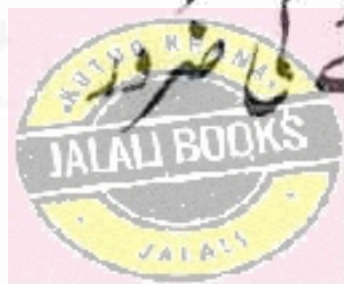
گُل گُوں ہے فضا مست ہے رُوحِ عالم
گُلشن میں چٹک رہے ہیں غُنچے پیہم
شاخوں سے لپٹ رہی ہے رہ رہ کے نسیم
سبزہ پہ لُٹا چُکی ہے موتی شبنم

چٹکے وہ شگوفے، وہ تکلّم جاگا
چہکے وہ طیور، وہ ترنّم جاگا
اے رُوحِ ملُول اُٹھ کہ جاگا عالم
وُہ رُوئے گلُستاں پہ تبسّم جاگا
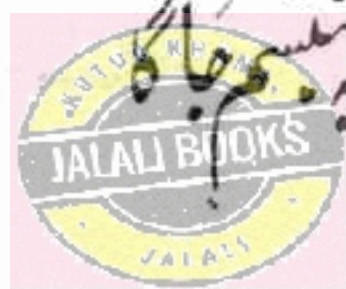
کل صُبح کہ تھا نُور میں ڈوبا عالم
تھی بادِ صبا بُوئے گُلِ تر سے نم
کیا جانئے کیوں اشک مرے بھر آئے
جیسے ہی چمن میں مُسکرائی شبنم

کلیوں کو دمِ صبح جگانے والی!

گُلشن میں پیامِ زیست لانے والی!

تُو غُنچۂ خاطر بھی کِھلا سکتی ہے؟
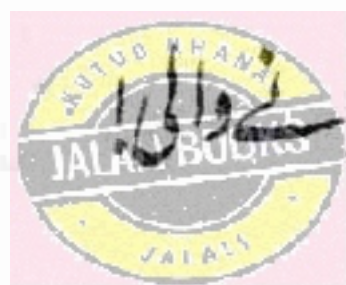
اے بادِ سحر پھُول کِھلانے والی!

گردوں پہ کُھلا ہوا ہے زرّیں پرچم

نغموں کی صدائیں آ رہی ہیں پیہم

دوشیزۂ شب چمن سے جاتے جاتے

پھُولوں پہ چھڑک گئی ہے ہلکی شبنم

دامن میں عروسِ شب کے جگنو گویا
افشاں سے چمکتے ہوئے گیسو گویا
نرگس پہ یہ شبنم کی جھلکتی بوندیں
اشکوں سے بھری ہے چشمِ آہو گویا
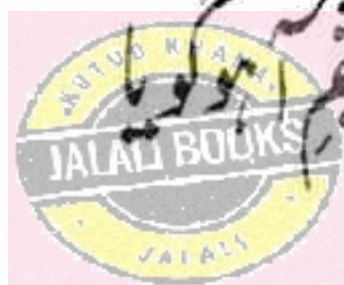
تاروں کی ہوئی محفل تاباں برہم
ہر سمت ہے چھایا ہوا غم کا عالم
سکتے میں ہیں گلستاں، فضا ہے خاموش
مل مل کے گلوں سے رو رہی ہے شبنم

کل صبح کہ تھی روحِ گلستاں بیدار
مسرور تھی بوئے گل فضائیں سرشار
یوں ناز سے بادِ صبحگاہی آئی
رقصاں ہوئی ہر روش پہ لیلائے بہار

پھر نقش نئے ابھار دے گی فطرت
ذرّہ ذرّہ سنوار دے گی فطرت
مرجھائے ہوئے چمن پہ گریاں کیوں ہو
پھر سے گلشن نکھار دے گی فطرت

ہر چند کہ باقی نہیں اب کوئی خوشی

آتی ہی نہیں بھول کے ہونٹوں پہ ہنسی

اس کشمکشِ یاس و الم کے باوصف

مایوس نہیں ہوں تری رحمت سے ابھی